ماہنامہ انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

ستمبر ۲۰۱۸

www.inzaar.pk

September 2018

زندگی میں بڑی کامیابی وہی لوگ پاتے ہیں جو چھوٹی کامیابی سے آغاز کرتے ہیں

جو لوگ بڑی کامیابی سے آغاز کرنا چاہتے ہیں ان کے حصے میں چھوٹی کامیابی بھی نہیں آتی

ابو یحییٰ کا نیا ناول شائع ہو گیا ہے

”خدا بول رہا ہے“

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

”جس طرح کسی انسان کو اپنی کوئی اولاد بری نہیں لگتی البتہ بعض بچے دوسروں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مصنف کو اپنی بعض تصنیفات زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ یہ قاعدہ اگر ٹھیک ہے تو ”خدا بول رہا ہے“ کی صورت میں اس دفعہ قارئین کی خدمت میں ایک ایسا ناول پیش ہے جس کے متعلق اس خاکسار کا خیال ہے کہ یہ اپنے پیغام کے لحاظ سے بہت موثر اور کہانی کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ یہ اس مصنف ہی کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا بھی خیال ہے جن کی خدمت میں اسے ابتدائی فیڈ بیک یا اسکریننگ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ قارئین اس ناول کو پچھلے ناولوں سے زیادہ مفید اور دلچسپ پائیں گے۔“

ابو یحییٰ

قیمت 300 روپے

رسالے کے قارئین رعایت کے ساتھ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں:

رابطہ: 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

ستمبر 2018ء ذوالحجہ/محرم 1440ھ

جلد 6 شمارہ 9

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ـــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com

برانڈز کی دوڑ

موجودہ دور کنزیومرازم کا دور ہے۔ اس دور میں لوگوں میں اشیاء کے بے دریغ استعمال کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس رجحان میں ایک نیا اضافہ مہنگی برانڈڈ اشیاء کی خریداری کا ہے۔ پہلے پہل تو لوگ قیمتی اشیائے تعیّشات ہی کسی خاص برانڈ کی لیا کرتے تھے، مگر اب عام استعمال کی چیزوں جیسے لباس، جوتوں وغیرہ میں بھی لوگ برانڈڈ چیزیں خریدتے ہیں۔

تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر برانڈ کا اصل مقصد تو اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنا ہوتا ہے۔ تاہم رفتہ رفتہ برانڈ ایک معیار کی علامت قرار پا چکی ہے۔ اور اب دنیا بھر میں یہ اسٹیٹس سمبل بن گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برانڈڈ پروڈکٹ عام اشیائے صرف کے مقابلے میں کافی مہنگی ہوتی ہیں اور اعلیٰ معیار کے ساتھ اونچی شان کا بیان بھی بن جاتی ہیں۔

برانڈز کا یہ تصور اپنے اندر ایک ممکنہ اخلاقی خرابی رکھتا ہے جس کی نشان دہی ضروری ہے۔ یہ اخلاقی خرابی اسراف، نمود و نمائش اور تکبر کی ہے۔ یہ وہ اخلاقی خرابیاں ہیں جو دنیا میں خرابی کے ساتھ آخرت میں جواب دہی اور خدا کے حضور گرفت کا سبب بھی بن جائیں گی۔

برانڈڈ چیزیں معیار کے ساتھ اپنے اندر مہنگی قیمت اور اظہار شان کا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی برانڈ کو اس کے معیار یا اپنے اعلیٰ ذوق کی بنا پر استعمال کرتا ہو۔ ایسی صورت میں اس کے استعمال کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کے پیش نظر اصل مقصد اظہار شان ہے تو وہ تکبر کا مرتکب ہوگا۔ اور اگر وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر مہنگی برانڈ خریدتا رہتا ہے تو اسراف کا مرتکب ہوگا۔ یہ دونوں بڑے اخلاقی گناہ ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کو مہنگی برانڈڈ اشیاء خریدنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے پیش نظر اظہار شان یا دوسروں سے مقابلے کی کوشش میں اپنی گنجائش سے مہنگی چیز لینا تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ایک گناہ بن جائے گا۔

دبئی اور پاکستان

ایک رپورٹ کے مطابق سال 2017 میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سیاح دبئی آئے جن سے دبئی کو تقریباً تیس ارب ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ جبکہ موجودہ برس کے ابتدائی چھ ماہ میں دبئی آنے والوں کی تعداد اکیاسی لاکھ ہو چکی ہے۔

دبئی پچیس لاکھ آبادی کا ایک چھوٹا سا صحرائی شہر ہے جس میں نہ فطرت کی رنگینیاں ہیں نہ تاریخ کے کوئی ایسے آثار جن کو دیکھنے لوگ دنیا بھر سے امنڈ آئیں۔ بس اس کے حکمرانوں کا یہ وژن تھا کہ ان کے پاس عرب کے دیگر ممالک کی طرح تیل نہیں ہے تو انھیں آمدنی کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا چاہیے۔ اس جذبے کے تحت انھوں نے دبئی کو دنیا کا جدید ترین شہر بنا دیا۔

دوسری طرف پاکستان میں سیاحت کے لیے ایسے پرکشش مقامات ہیں کہ ان کے ذریعے سے پاکستان اپنا نوے ارب ڈالر کا قرضہ صرف ایک سال میں اتار سکتا ہے۔ پاکستان میں حسن فطرت کے ایسے متنوع مظاہر بیک وقت موجود ہیں کہ جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اسکردو کا ٹھنڈا سفید صحرا، دیوسائی کا میدان جو دنیا کی دوسری بڑی سطح مرتفع، حسین پھولوں اور جھیلوں کی جنت ہے۔ کے ٹو، نانگا پربت، راکا پوشی وغیرہ جیسے بلند پہاڑ، تھر اور چولستان جیسے وسیع عریض صحرا، وادی کیلاش، وادی کاغان اور وادی سوات میں بکھرا ہوا فطری حسن، کراچی سے گوادر تک حسین ساحلی پٹی اس کی چند مثالیں ہیں۔ اس کے ساتھ ٹیکسلا، ہڑپہ، موہنجودڑو کی شکل میں قدیم ترین تاریخ اور ہندومت، بدھ مت اور سکھوں کے مقدس تاریخی آثار سمیت وہ چیزیں ہیں جو دنیا بھر کے کروڑوں سیاحوں کو ہر سال پاکستان لانے کے لیے بہت ہیں۔

پاکستان کے یہ حسین مناظر اہل پاکستان کو پکار رہے ہیں کہ آؤ اور ہمارے ذریعے سے اپنے سارے مسائل حل کر لو۔ کاش کوئی اس پکار کو سن لے تو اس ملک کا بہت بھلا ہو جائے گا۔

سیاسی انتہا پسندی

پچھلے دو عشروں سے مذہبی انتہا پسندی کے نتائج بھگتنے کے بعد آج کل ہم سیاسی انتہا پسندی کے عفریت کو بے قابو دیکھ رہے ہیں۔ سیاسی انتہا پسندی مذہبی انتہا پسندی سے کم خطرناک نہیں ہوتی۔ بلکہ تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ باعتبار نتائج سیاسی انتہا پسندی کسی سماج کے لیے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاستدانوں کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے۔ اقتدار کی یہ طاقت جب انتہا پسندی سے ملتی ہے تو فاشزم، جنگ و جدل اور شیطنت کا راج قائم ہو جاتا ہے۔ معصوم لوگوں کا قتل، اہل علم و دانش کی زباں بندی اور ظلم و بربریت اس انتہا پسندی کے لازمی نتائج ہیں۔

پاکستان میں سیاسی انتہا پسندی کے فروغ کا ایک اہم سبب وہ سیاسی مبصرین ہیں جو ٹی وی ٹاک شوز اور اخباری کالموں میں نفرت اور یکطرفہ نقطہ نظر کے فروغ کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اپنی دانست میں یہ لوگ شاید کسی برائی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہوں، مگر ان کو معلوم نہیں کہ انتہا پسندانہ رویہ اپنی ذات میں خود سب سے بڑی برائی ہے۔ یہ رویہ معاشرے میں برداشت اور اختلاف رائے کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے۔ یہ رویہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ یہ رویہ آخر کار معاشرے میں سوچنے اور غور کرنے کا دروازہ ہی بند کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ملک میں جبر کی تاریک رات چھا جاتی ہے۔ خوف کے سائے ہر جگہ پھیل جاتے ہیں۔ جان ، مال اور آبرو کی حرمت پامال ہو جاتی ہے۔

ہمیں اپنے ملک کو اگر اس صورتحال سے بچانا ہے تو انتہا پسندی کی ہر قسم سے اپنے لوگوں کو بچانا ہوگا۔ ان کے اندر تحمل اور برداشت پیدا کرنا ہوگا۔ ہر اس شخص سے بچنا ہوگا جو انتہا پسندی کو فروغ دے۔ ہم نے یہ نہیں کیا تو ایک عظیم تباہی کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے۔

جاپان اور پاکستان

جاپان دنیا کی بہترین گاڑیاں بنانے والے ممالک میں سے ایک ہے۔ٹویوٹا، ہنڈا اور دیگر کئی جاپانی برانڈز کی گاڑیاں دنیا کے متعدد ممالک میں پسند کی جاتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جاپان کی نئی ہی نہیں بلکہ پرانی گاڑیاں بھی دنیا کے کئی ممالک میں برآمد کی جاتی ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جاپان میں معیار کی پابندی اور قوانین کی سختی کی وجہ سے پرانی گاڑی رکھنا اور پرانی گاڑی کو ٹھکانے لگانا ایک بہت مہنگا اور مشکل کام ہے۔ چنانچہ جاپانیوں نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ اپنی تین سے چھ سال پرانی استعمال شدہ گاڑیاں آکشن یا نیلام میں بیچ کر نئی گاڑیاں لے لیتے ہیں۔ نیلام گھر سے یہ پرانی گاڑیاں دنیا کے کئی ممالک، بشمول پاکستان، کے لوگ خرید کر اپنے ملک منگا لیتے ہیں۔یوں جاپانیوں کی پرانی گاڑیاں ان پر بوجھ بننے کے بجائے اچھے پیسوں میں بک جاتی ہیں اور پاکستان جیسے غریب ممالک کے لوگوں کو بہت اعلیٰ کوالٹی کی گاڑیاں بہت بھاری ڈیوٹی کے باوجود نسبتاً بہتر قیمت پر مل جاتی ہیں۔

جاپان کی یہ پرانی گاڑیاں کوالٹی اور جدت کے لحاظ سے پاکستان میں بننے والی انھی کمپنیوں جیسے ٹویوٹا اور ہنڈا وغیرہ کی نئی گاڑیوں سے بھی بہتر ہوتی ہیں۔اس لیے لوگ انھیں شوق سے خریدتے ہیں۔نہ صرف ان کا معیار بلکہ ان میں استعمال کی جانے والی ٹیکنالوجی بھی مقامی گاڑیوں سے بہت بہتر ہوتی ہے۔ ہنڈا، سوزوکی یا ٹویوٹا کمپنی کی پرانی جاپانی گاڑی نئی مقامی گاڑی سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتی ہے۔بعض ٹیکنالوجی تو ایسی ہے جو مقامی طور پر دستیاب ہی نہیں۔ جیسے بجلی سے چلنے والی ماحول دوست گاڑیاں جو بہت کم پٹرول کھاتی ہیں، مقامی طور پر دستیاب ہی نہیں۔تاہم اس طرح کی پرانی چیزوں کی ایک قیمت ہے۔ وہ یہ کہ پرانی گاڑیاں رفتہ رفتہ ماحول کو تباہ اور سڑکوں پر حادثات کو جنم دینے کا باعث بن جاتی ہیں۔

یہ فرق صرف دو قسم کی گاڑیوں ہی کا نہیں بلکہ دو قوموں کا بھی فرق ہے۔ایک قوم ہے جہاں

معیار سب سے اہم ہوتا ہے۔ جہاں ماحولیاتی تحفظ اہم ہے۔ جہاں انسانی جان کا تحفظ ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔دوسری قوم ہے جہاں منافع سب سے اہم ہے۔ جہاں ہر قانون پیسے اور طاقت کے زور پر بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے۔ جہاں انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

دو قوموں کے درمیان یہ فرق کسی سازش نے پیدا نہیں کیا ہے۔ دو قوموں کے درمیان یہ فرق ان کی لیڈر شپ نے پیدا کیا ہے۔ جاپان کی لیڈر شپ نے دوسری جنگ عظیم کی تباہی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ جنگ میں بے پناہ اخراجات کر کے بھی آخر کار آپ تباہ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تعلیم پر خرچ کر کے آپ ترقی میں دنیا بھر سے آگے نکل جاتے ہیں۔ جاپان کی لیڈر شپ نے دوسری جنگ عظیم میں اپنے بدترین دشمن امریکہ سے شکست کھانے کے بعد قوم کو نفرت کا درس نہیں دیا۔ بلکہ تعمیر کی سوچ دی۔انھیں یہ سکھایا کہ نفرت اور دشمنی سے آپ دوسروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج پاکستانی قوم تباہی کے کنارے پر آکھڑی ہوئی ہے۔اس کا سبب کسی دشمن کی کوئی سازش نہیں بلکہ ہمارے اندر پھیلی ہوئی منفی سوچ ہے۔ یہ سوچ کبھی ہمیں اپنا احتساب نہیں کرنے دیتی۔ یہ سوچ ہمیں اپنے سطحی جذبات سے اوپر نہیں اٹھنے دیتی۔ یہ سوچ ہر مسئلے کی جڑ دوسروں کو سمجھتی ہے اور اپنی اصلاح کے تصور ہی سے خالی ہے۔اس سوچ کو آپ اپنی مجلسوں، پرنٹ اور الیکٹرونک اور سوشل میڈیا ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

اگر ہمیں اپنی قوم کی تقدیر بدلنی ہے تو ہمیں اس منفی سوچ سے نجات پانا ہوگی جو ہر چیز کا الزام دوسروں کو دے کر خود کو بری الذمہ سمجھتی ہے۔ جو اپنی آنکھ کا شہتیر بھول کر دوسروں کی آنکھ کا تنکا ڈھونڈنے میں مصروف رہتی ہے۔ جو خود چھلنی کی طرح سوراخ دار ہو کر سوئی سے شکایت کرتی ہے کہ اس میں سوراخ ہے۔ اپنا احتساب اور اپنی تعمیر۔ یہی دنیا میں ترقی کا راستہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ تباہی کا راستہ ہے۔

خدا، عدل اور انسان

[فیس بک پر ایک صاحب نے خدا کے وجود کے حوالے سے کچھ سوالات اٹھائے تھے، ان کے جواب میں ابو یحییٰ صاحب نے یہ آرٹیکل تحریر کیا جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ادارہ]

سوال اٹھانا اچھی بات ہے۔ یہ علم کا دروازہ ہے۔اس عمل کی تحسین کی جانی چاہیے۔مگر اس سے زیادہ بڑی خوبی یہ ہے کہ سوال اپنی ذہنی گرہ کو کھولنے کے لیے کیا جائے۔یہی سوال مستحق جواب ہے اور ایسا سائل ہی راہ پاتا ہے۔لیکن معاملہ یہ نہیں اور سوال اپنے نقطہ نظر کی تائید میں اٹھایا گیا ہو تو یہ سوال نہیں اعتراض برائے اعتراض ہے۔ایسے سوال کا جواب تو دیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ جواب کبھی اطمینان بخش نہیں ہوتا۔اس لیے کہ ایسے سائل کے پیش نظر اطمینان قلب کا حصول ہوتا ہی نہیں۔لیکن جواب پھر بھی دیا جانا چاہیے۔نجانے کس دل میں ہدایت کی خواہش کب جاگ جائے۔ہم اپنے سردار کی پیروی میں اسی کے مکلّف ہیں۔وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔

خدا تمام مخلوق کا خالق ہے۔کسی مخلوق کی مجال نہیں کہ وہ خدا کی مرضی کے بغیر پَر بھی مار سکے۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ انسانوں نے اس خدائی قدرت سے روزِ ازل استثنا مانگا تھا۔ یہ استثنا انہیں دے دیا گیا اور خدا نے اپنے اختیار کو بطور امانت انسانوں کو عطا کر دیا۔یہی وہ اختیار ہے جسے استعمال کر کے آج انسان اس دھرتی کے خشک وتر پر حاکم ہے۔انسانوں نے ہمیشہ اپنے اس اختیار کو مانا اور سمجھا ہے اور اسی حقیقت کی بنیاد پر اپنے اندر کے ان لوگوں کو سزا دی ہے جنھوں نے اس اختیار کا غلط استعمال کیا۔اسی اصول پر عدالتیں بنتی ہیں۔اسی اصول پر قاتل، ڈاکو، چوروں کو سزا دی جاتی ہے۔

سو اب جس کو خدا کی عدالت پر اعتراض ہے، پہلے وہ انسانوں کی عدالتوں کو بند کروائے۔ سارے قاتلوں، چوروں، رہزنوں اور معصوم بچیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر ان کی لاش کو کوڑے

کے ڈھیر پر پھینک دینے والے سفاک مجرموں کو عدالت سے اس اصول پر بری کروائے کہ یہ دماغ کے کچھ کیمیکل کی کارستانی تھی۔ اس لیے اس مجرم کو نہیں پکڑو، اس کے اس خالق کو پکڑو جس نے اسے بنایا ہے۔ یہ منطق جب ساری دنیا کی عدالتیں مان لیں گی تو پھر خدا کی عدالت پر سوال کیا جا سکتا ہے۔ رہا عالم کا پروردگار تو اطمینان رکھیے کہ وہ بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ کسی کے پاس قابل قبول عذر ہوا تو وہ اسے ضرور سنے گا۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اختیار اور جواب دہی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انسان خدا کی عدالت میں اس لیے جواب دہ ہوگا کہ وہ صاحب اختیار بھی بنایا گیا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر صاحب اقتدار بھی ہے۔ خدا کی عدالت کی یہی وہ پیشی ہے جس سے خبردار کرنے انبیا آتے ہیں۔ ہم اپنی بات پھر دہرا دیں، انبیا خبردار کرنے آتے ہیں۔ ڈرانے نہیں آتے۔ ان کا خبردار کرنا اس شفیق ماں کی تنبیہ کی طرح ہوتا ہے جو بچے کو دھیان سے سڑک پار کرنے کی تلقین کرتی ہے، بری صحبت سے بچنے کا مشورہ دیتی ہے، غیر صحت مند رویوں سے روکتی ہے۔ جب تک دنیا میں خطرے باقی ہیں، لوگ اپنے پیاروں کو خبردار کرتے رہیں گے۔ یہ عمل اگر قابل اعتراض نہیں تو حضرات انبیا آخرت کے جس خطرے سے خبردار کرتے ہیں، اس پر اعتراض کا کیا محل ہے؟

ہاں نبیوں کے مشن کا ایک اور جز بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ سرکشی اور ظلم پر آمادہ ہوں وہ ان کو خدا کی پکڑ سے ڈراتے ہیں۔ اگر آپ نیک ہیں، اچھے ہیں، خیر کے کام کرتے ہیں تو اس ڈرانے کے مخاطب آپ ہیں نہ آپ کو اس پر اعتراض کرنا چاہیے۔ آپ کو تو انبیا خوش خبری سناتے ہیں۔ امید دلاتے ہیں کہ مجموعی طور پر آپ ٹھیک ہوں تو اللہ تعالیٰ چھوٹی موٹی غلطیاں ویسے ہی معاف کر دیں گے۔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بڑے گناہ بھی ہو جائیں تب بھی خدا کی رحمت؛ توبہ اور اصلاح کے دروازے موت سے پہلے ہمیشہ کھول کر رکھتی ہے۔ وہ اپنی نیکی کی دعوت کو اسی اصول پر پیش کرتے ہیں کہ تم اس کی تائید اپنے اندر سے پاؤ گے۔ ایسے میں انبیا پر یہ الزام لگانا کہ وہ خوف

دلا کر لوگوں کو نیک بناتے ہیں، محتاط الفاظ میں بھی ان کی دعوت کے غلط فہم کے مترادف ہے۔

رہی یہ بات کہ دنیا کی سزا و جزا کی موجودگی میں آخرت کی سزا و جزا کی ضرورت نہیں تو یہ بھی ایک غلط فہمی ہے۔ اول تو دنیا میں ہر مجرم کو سزا نہیں ملتی نہ ہر نیک شخص کو اس کی خوبیوں کی جزا ملتی ہے۔ مل بھی جائے تو اکثر اوقات جرم کی شدت اور نیکی کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ عدل کے تقاضے سزائے موت دے کر بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ جس شخص کی گردن پر لاکھوں لوگوں کی موت کی ذمہ داری ہو، اس کے لیے ایک بار کی موت کیا سزا ہوئی؟ جس شخص نے اپنی ایجادات سے ہزاروں لوگوں کی جان بچائی ہو، اسے اس دنیا میں کوئی کیا جزا دے سکتا ہے؟

اس لیے ضروری ہے کہ ایک دن آئے جب عدل کامل ہو۔ جب رائی کے دانے برابر عمل بھی سامنے لایا جائے۔ جب ہر مظلوم کا دل ٹھنڈا کیا جائے۔ ہر ظالم کو اس کے انجام تک پہنچایا جائے۔ ہر نیک کو اس کی نیکی کا ختم نہ ہونے والا بدلہ دیا جائے۔ یہ دن تو انسانی فطرت کی پکار ہے۔ اس کا انکار کرنا اپنی فطرت کے انکار کے مترادف ہے۔

آخری بات بھی ایک غلط فہمی ہے۔ خدا انسانوں سے اپنا تعارف ڈرانے والی ہستی کے طور پر نہیں کراتا۔ قرآن کی ہر سورت اس اللہ کے نام سے شروع ہوتی ہے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ قرآن کا پہلا جملہ خدا کا یہی تعارف اس طرح کراتا ہے کہ اللہ رب العالمین اپنی عطا و بخشش کی بنا پر ہر حمد کا مستحق ہے کیونکہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ تعارف محبت پیدا کرتا ہے، خوف نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدا ڈراتا بھی ہے، مگر صرف مجرموں، ظالموں اور سرکشوں کو۔ آپ ایسے نہیں تو ڈرتے کیوں ہیں؟ شکر ادا کیجیے۔ اور اگر ہیں تو پھر خدا سے بے خوف رہنا کام نہیں آئے گا۔

خدا فلسفے کا ایک تصور نہیں۔ ایک زندہ ہستی ہے۔ اس نے جو اختیار ہمیں دیا ہے وہ بہت جلد اسے سلب کرنے والا ہے۔ خوش نصیب ہے جو اس اختیار سے خدا کی عنایتوں کو پالے۔ بہت بدنصیب ہے وہ جو اس اختیار کو پا کر خدا کو بھول جائے۔

ناقابلِ معافی جرم

قرآن مجید کی سورہ نساء میں دو مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ بس اس بات ہی کو معاف نہیں کریں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔ اس کے سوا وہ جس گناہ کو چاہیں گے اور جس شخص کے لیے چاہیں گے معاف کر دیں گے۔

قرآن مجید کے اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شرک کرنا کس درجہ کا قابلِ نفرت کام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن مجید شرک کے خلاف دلائل کی بڑی تفصیل کر کے یہ بتاتا ہے کہ اس کی کوئی عقلی یا فطری بنیاد نہیں ہے۔ قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ شرک کا سبب صرف اور صرف لوگوں کا یہ تعصب ہے کہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کو شرک کرتے ہوئے ہی پایا۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اصل ناقابلِ معافی جرم تعصب ہے جو شرک کا باعث بنتا ہے۔

تعصب کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول یا حالات کی بنا پر کسی چیز سے مانوس ہو جائے اور پھر کسی طور اس چیز کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو۔ چاہے علم و عقل کے کتنے ہی دلائل سے اس کی غلطی واضح کر دی جائے۔ اس سے آگے بڑھ کر تعصب انسان کو ایسا اندھا کر دیتا ہے کہ انسان کوئی دوسری بات سننے کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ یہ امکان تسلیم کرنے کو تیار ہوتا ہے کہ اس کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ہر معقول بات کے جواب میں ایک سطحی بات بول دیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعصب کتنا خطرناک مرض ہے۔ یہ انسان کے اندر سچائی کو دیکھنے، ماننے اور اسے قبول کرنے کی استعداد ہی ختم کر دیتا ہے۔ تعصب کا یہ مرض صرف انبیا کے منکرین ہی میں نہیں ہوتا بلکہ یہ ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے مانوس اور متاثر ہو جانا ایک عام انسانی وصف ہے۔ اس کی سادہ ترین مثال یہ ہے کہ کسی انسان کے جسم سے اٹھنے والی پسینے کی ناگوار بو اسے محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ دوسرے لوگ اسے فوراً محسوس

کر لیتے ہیں۔ یہی معاملہ ان نظریات اور خیالات کا ہے جو چاہے کتنے ہی غلط اور بے بنیاد کیوں نہ ہوں، لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ انھیں مانتے ہیں اور ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے۔

تعصب کے حوالے سے یہی وہ خوفناک حقیقت کہ یہ ہر انسان میں پایا جا سکتا ہے، ایک بندہ مومن کو لرزا دینے کے لیے بہت ہے۔ بندہ مومن جانتا ہے کہ جلد یا بدیر اس کا سامنا رب العالمین سے ہوگا۔ خدا کے غضب اور جہنم کو برداشت کرنا ایک ناممکن کام ہے۔ خدا کا یہ غضب سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر ہوگا جو اپنے تعصّبات کے مریض رہے ہیں۔ اس لیے کہ تعصب کے بعد انسان ہر سچائی کا انکار کر دیتا ہے اور ہر ظلم و زیادتی کو جائز سمجھنے لگتا ہے۔

ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالیں تو آج ہم ایسے ہی فرقہ وارانہ اور سیاسی تعصّبات کے دور میں زندہ ہیں۔ کوئی شخص اپنے تعصب کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ کتنی ہی بڑی دلیل سامنے آ جائے لوگ اطمینان سے دو بے معنی الفاظ بول کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے سچائی کو رد کر دیا۔ لوگ اپنے فرقے اور اپنے سیاسی رہنما کی ہر غلطی کی کوئی نہ کوئی جھوٹی تاویل کر لیتے ہیں۔ وہ مخالف کی ہر درست اور سچ بات کو چند خوبصورت الفاظ بول کر ہوا میں بکھیر دیتے ہیں۔ کوئی شخص کتنی ہی بڑی سچائی لے کر آئے، وہ صرف زبان سے ایک جملہ نکالتے ہیں کہ یہ آدمی فلاں گروپ کا ہے اس کے بعد متعصب لوگ سچائی کے اعتراف کے لیے گونگے، اسے سننے کے لیے بہرے اور اسے دیکھنے کے لیے اندھے بن جاتے ہیں۔ ان کے سینے میں موجود دل پتھر کی وہ سل بن جاتا ہے جس پر کوئی بات اثر نہیں کر پاتی۔

مگر ان اندھوں اور پتھر دلوں کو جان لینا چاہیے کہ یہ انکارِ حق کے مجرم ہیں۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ جس روز وہ خدا کی بارگاہ میں پیش ہوں گے ان پر جہنم کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ اس روز یہ اندھے متعصب لوگ جانیں گے کہ خدا کی دنیا میں تعصب کتنا بڑا جرم تھا۔

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

الیکشن کے بعد

2018 کے الیکشن کا ہنگامہ آخر کار ختم ہوا۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا موقع ہے کہ دو مسلسل جمہوری حکومتوں نے اپنی پانچ سالہ مدت پوری کی۔ 2008 میں پی پی پی اور 2013 میں مسلم لیگ نے الیکشن جیت کر مرکزی حکومت بنائی۔ جبکہ اس تیسرے الیکشن میں عمران خان کی پی ٹی آئی اپنی حکومت بنا رہی ہے۔ یہ صورتحال کئی پہلوؤں سے خوش آئند ہے۔ اس پر انشاء اللہ آج تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

جمہوری عمل کی اہمیت

سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوری عمل کا تسلسل جاری ہے۔ جمہوری عمل پرامن انتقالِ اقتدار کا وہ واحد راستہ ہے جو انسانی سماج نے اپنے ارتقا کے کئی مراحل دیکھنے کے بعد دریافت کیا ہے۔ اس عمل میں کوئی بادشاہ، کوئی خاندان، کوئی گروہ اور کوئی طاقتور یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ عوام کی مرضی کے خلاف اقتدار میں آجائے۔ ہر حکمران عوام کی مرضی سے اقتدار میں آتا ہے اور جب عوام کا اعتماد ختم ہوجاتا ہے تو وہ ایک مقررہ وقت کے بعد اس کی جگہ کسی دوسرے شخص یا گروہ کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

جمہوری عمل میں ضروری نہیں ہوتا کہ سب کچھ آئیڈیل ہو۔ آئیڈیل طرز حکومت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی شخص کا انتخاب کر کے اسے حکمران بنا دیں۔ یہ سلسلہ ختم نبوت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اب انتخاب صرف آمریت ہے یا جمہوریت تیسری کوئی شکل دنیا میں موجود نہیں۔

بعض لوگ خلافت کو ایک متبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ تقابل درست نہیں۔ خلافت کسی طرز حکومت کا نام نہیں۔ یہ مسلمانوں کے سیاسی نظمِ حکومت کا تاریخی نام ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں صحابہ کرام نے اپنی مرضی سے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کیا تھا۔ اسی کو جمہوری طرز حکومت کہتے ہیں۔ دور جدید میں اس میں صرف دو بنیادی اضافے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حکمران کو ہر چند برس بعد جا کر عوام سے اعتماد کا ووٹ لینا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذرائع مواصلات کی ترقی کی بنا پر اب مملکت کے ہر ہر باشندے کی رائے معلوم کرنا ممکن ہو چکا ہے۔ ورنہ اپنی اصل میں خلافت راشدہ ایک جمہوری نظام تھا جس میں قریش جنھیں عرب پہلے ہی اپنا حکمران مانتے تھے، باہمی رضامندی سے اپنا حکمران چنتے تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حکمران پارٹی کسی وجہ سے اپنا وزیر اعظم بدل لیتی ہے۔ اس کے بالکل برعکس خلافت راشدہ کے بعد مختلف خاندانوں نے تلوار کے بل بوتے پر زبردستی اقتدار پر قبضہ کیا اور ایک بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا حکمران بنتا رہا۔ اسی کو آمریت کہتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ خلافت کی بات کرتے ہیں وہ بتائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اقتدار پر بالجبر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے آمریت کہتے ہیں۔ اور عوام کی مرضی سے منتخب ہونا چاہتے ہیں تو اسے جمہوریت کہتے ہیں۔ تیسرا کوئی انتخاب اس دنیا میں موجود نہیں۔

جمہوریت کی خرابیاں

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، لیکن جو اصل بات ہم بیان کر رہے تھے وہ یہ تھی کہ جمہوریت کوئی آئیڈیل نظام تو نہیں ہے لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ انسانیت کے پاس اب موجود نہیں۔ ہمارے نزدیک جمہوریت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی لیڈر اپنی کرشمہ ساز شخصیت یا کوئی گروہ اپنی طاقت، وسائل اور میڈیا پر کنٹرول کر کے عوام ہی سے غلط فیصلہ کرا سکتا ہے۔ مگر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ پھر تو جو عوام منتخب کریں گے وہی بھگتیں گے۔ اس کے

علاوہ بھی جمہوری نظام کی کئی اور خامیاں ہیں، لیکن ان سب کا علاج یہی ہے کہ جمہوری عمل تسلسل سے جاری رہے۔ یہ تسلسل ہی اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ اس نظام کی کمزوریاں کم سے کم ہوتی چلی جائیں۔

اس پس منظر میں ہمارے ملک میں تین مسلسل جمہوری حکومتوں کا ایک کے بعد ایک کر کے مقررہ وقت پر اقتدار میں آنا اپنی ذات میں بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس عمل سے حکمرانوں پر قانون کی بالادستی کی روایت غیر محسوس طریقے سے قائم ہو رہی ہے۔ یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو ایک طرف ہر سطح پر قانون کی بالادستی کا چلن عام ہوگا اور دوسرے یہ امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا کہ کوئی غیر جمہوری راستے سے اقتدار میں آئے۔ مزید یہ کہ اس تسلسل سے عوام میں یہ اعتماد پیدا ہو رہا ہے کہ ہمارے پاس یہ قوت ہے کہ ہم اپنے حکمرانوں کو بدل سکتے ہیں۔ یہی عوامی اختیار جمہوری نظام میں بہتری کا ضامن ہے۔

دھاندلی کا معاملہ

اس الیکشن کی شفافیت پر ہارنے والی جماعتوں نے سوال اٹھایا ہے۔ اس بات کے دو پہلو ہیں۔ ایک سول سپر میسی جس پر ہم آگے بات کریں گے۔ دوسرے طریقہ کار کی وہ خرابیاں جن کی بنا پر دھاندلی کا امکان پیدا ہوا۔ یہ وہ چیز ہے جس کا حل انھی سیاسی جماعتوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ الزام لگاتی ہیں۔ پچھلے دس برسوں میں کم و بیش ملک کی ہر سیاسی جماعت نے کبھی نہ کبھی دھاندلی کی شکایت کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اگر اس بات میں سنجیدہ تھے تو پارلیمنٹ میں بیٹھ کر ایسی قانون سازی کیوں نہیں کرائی جس سے الیکشن زیادہ شفاف ہو جاتے۔ مثال کے طور پر اس دفعہ یہ الزام لگایا گیا کہ پولنگ ایجنٹس کو ایک خاص فارم نہیں دیا گیا جس پر وہ ووٹوں کی تعداد درج کرتے تھے یا یہ کہ ان کو گنتی کے وقت باہر نکال دیا گیا۔

اس کا بہت سادہ حل یہ ہے کہ یہ قانون بنا دیا جائے کہ ووٹنگ اور ووٹوں کی گنتی کے دوران میں صحافیوں یا میڈیا کی موجودگی لازمی ہوگی۔ یا کم از کم کوئی ان کی موجودگی پر پابندی نہیں لگا سکتا جیسا کہ اب لگائی گئی تھی۔ غیر جانبدار صحافیوں کی موجودگی میں اس طرح کی دھاندلی نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ سیاسی جماعتیں اس نوعیت کی قانون سازی کی کوشش کر کے اس طرح کے سقم کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتیں تو اپنے ہر دعوے میں غیر سنجیدہ رہیں گی۔ یہی ماضی میں ہو چکا ہے کہ دھاندلی کا الزام لگانے والوں نے پارلیمنٹ کی قانون سازی کا راستہ اختیار نہیں کیا جو مسئلے کا اصل حل تھا۔ اس کے بجائے پارلیمنٹ سے باہر احتجاج کا وہ راستہ اختیار کیا جو خلاف قانون بھی تھا اور نتیجے کے اعتبار سے لاحاصل بھی رہا۔

سول سپرمیسی

اس الیکشن میں سول سپرمیسی کی بات بھی بڑے پیمانے پر کی گئی۔ اس اصول سے اتفاق کرنے کے باوجود ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ سول سپرمیسی ایک قانونی اصول کا نام ہے۔ یہ اصول تب تک روبہ عمل نہیں ہوسکتا جب تک خود سویلین ہر معاملے میں قانون کی پاسداری کی عادت نہیں ڈالتے۔ حال یہ ہے کہ سویلین حکمران خود تو اس پارلیمنٹ کو جو تمام قانون سازی کا ماخذ ہے وہ اہمیت دیتے نہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ سویلین حکمران اپنے فائدے کے لیے قانون کو کھلواڑ بنا کر رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ کمزور ہو کر اپنے مفاد کے لیے قانون کو اہمیت نہیں دیتے نہ اسے مانتے ہیں تو کسی طاقتور سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قانون کی پاسداری کرے گا، ایک امر لاحاصل ہے۔

سول سپرمیسی کے حوالے سے دوسری بات یہ ہے کہ ہماری اسٹبلشمنٹ یہ دیکھتی ہے کہ ان حکمرانوں نے سول بیوروکریسی کے ساتھ کیا سلوک کر رکھا ہے۔ ان کو اپنا ذاتی ملازم بنا کر رکھا ہوا

ہے۔ کسی میرٹ کے بغیر ذاتی وفاداری کی بنیاد پر تقرریاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد فوج تو کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ یہی کچھ سویلین حکمران ان کے ساتھ بھی شروع کر دیں اور پورے ادارے کا بیڑہ غرق ایسے ہی ہو جائے جیسے بیوروکریسی کا بیڑہ غرق ہوا ہے۔ چنانچہ وہ سویلین حکمرانوں کو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔

تیسری اور سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ سول سپرمیسی ایک اخلاقی قدر ہے۔ جب تک سویلین حکمران اخلاقی اقدار کو اپنا مسئلہ نہیں بنائیں گے تب تک کسی طاقتور ادارے کو محض اخلاقی بنیادوں پر یہ سمجھانا کہ آپ کا کام حکومت کے کاموں میں مداخلت کرنا نہیں، زیادہ موثر نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھیے کہ اخلاقی زوال کے دور میں سب سے زیادہ نقصان کمزور کا ہوتا ہے۔

اس حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ سیاست کی دنیا میں کوئی اصول صرف اس بنیاد پر نہیں منوایا جاسکتا کہ وہ صحیح ہے۔ اس کے لیے مناسب حالات فراہم کیے جانا ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں جمہوریت کا پودا مکمل جڑ پکڑ چکا ہو۔ حکمران اقتدار کو اپنے خزانے بڑھانے کے بجائے عوام کی خدمت اور فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔ ان کی کارکردگی مثالی نہ سہی کم از کم معیاری ضرور ہو۔

یہ سب چیزیں خود سویلین میں بتدریج پیدا ہوں گی۔ تین الیکشن مزید ہونے دیں، یہ ساری چیزیں پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اس کے بعد ہم سول سپرمیسی کا دور بھی دیکھ لیں گے۔ ورنہ ابھی اگر سول سپرمیسی آ بھی گئی تو سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ ایک نوعیت کی سویلین آمریت قائم ہو جائے گی۔

حکمرانوں سے گزارشات

ان اصولی باتوں کے بعد حکمرانوں کی خدمت میں کچھ گزارشات۔ اس الیکشن میں عمران

خان صاحب بائیس سال کی طویل جدوجہد کے بعد ملک کے نئے وزیراعظم بن رہے ہیں۔ مرکز کے علاوہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں ان کی حکومت قائم ہورہی ہے۔ کے پی کے میں ان کی جماعت حکومت میں ہونے کے باوجود دوبارہ اقتدار میں آرہی ہے۔ بلوچستان میں وہ مخلوط حکومت کا حصہ ہیں۔ جبکہ سندھ میں پی ٹی آئی شہری علاقوں خاص کر کراچی کی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری ہے۔

اس لحاظ سے ان پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوچکی ہے۔ وہ ان ذمہ داریوں کو کیسے پورا کرتے ہیں، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ مگر ہم دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس ملک کے لیے خیر و برکت کا باعث بنائیں۔ اس حوالے سے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہوگی کہ جس کرپشن کے خلاف انھوں نے ایک فضا بنائی ہے، اپنی حکومت میں اس کا خاتمہ کریں۔ وہ اپنے وعدوں اور دعووں میں سے آدھے بھی نبھادیں تو ملک بہت آگے بڑھ جائے گا۔ سیاست میں تو عمران خان نے اپنے وعدوں کے برخلاف مروجہ چلن اختیار کرلیا ہے۔ ان کے حامی بھی یہ کڑوا گھونٹ اس امید پر پی گئے کہ وہ گڈ گورننس سے اس کا ازالہ کردیں گے۔ مگر سیاست کے بعد حکومت میں بھی انھوں نے مروجہ چلن کو اختیار کیا تو پھر ان کا اور پاکستان دونوں کا مستقبل کوئی اچھا نہیں ہے۔

ان کی دوسری ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ جذبات میں آکر غیر ضروری محاذ نہ کھولیں۔ اپنی توجہ معیشت، گڈ گورننس، میرٹ، عوامی فلاح و بہبود اور سویلین سطح پر قانون کی بالا دستی پر رکھیں۔ وہ اگر مکمل اختیار کی خواہش میں طاقتور طبقات سے ٹکرائیں گے تو ان کا تو جو نقصان ہوگا سو ہوگا، ملک کا بھی بہت نقصان ہوگا۔

عمران خان کی تیسری اور عوامی سطح پر سب سے بڑی ذمہ داری کراچی کی ترقی ہے۔ عمران

خان اگر حکومت بنانے کی پوزیشن میں آئے ہیں تو اس کی ایک اہم وجہ کراچی کے عوام کا ان کو اکثریت سے منتخب کرنا ہے۔ کراچی کے عوام نے نہ صرف قوم پرستی کی آوازوں کو رد کرکے قومی دھارے میں خود کو شامل کیا ہے بلکہ تاریخ میں پہلی دفعہ کراچی سے جیتنے والی جماعت اقتدار میں بھی ہے۔ اگر اس کے نتیجے میں بھی کراچی میں کوئی بڑی بہتری نہ آئی تو پھر جو صورتحال یہاں پیدا ہوگی، اس میں ملک کے لیے کوئی خیر و فلاح نہیں ہے۔

اپوزیشن سے گزارشات

اس دفعہ پارلیمنٹ میں بہت مضبوط اپوزیشن موجود ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ شکست کے بعد اپوزیشن نے سڑکوں پر احتجاج کے بجائے پارلیمنٹ کو ترجیح دی ہے۔ سیاست میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے اور ایک دور کی اپوزیشن کو دوسرے دور میں حکومت میں آنے میں دیر نہیں لگتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ مخالفت برائے مخالفت کے بجائے تعمیری تنقید اور عوام کی فلاح پر مبنی قانون سازی کو یقینی بنایا جائے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں لوگ قانون سازی کی اہمیت سے واقف نہیں۔ مہذب دنیا میں تو پارلیمنٹ کا صرف ایک ہی کام ہوتا ہے کہ عوام کی مشکل کو دور کرنے اور ان کی فلاح کے لیے مسلسل قانون سازی کرتی رہے۔ یہ اصل میں اپوزیشن کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ چن چن کر ان ایشوز کو ڈھونڈتی ہے جہاں عوام کی مشکلات دور ہوں۔ پھر وہ اپنی اسی کارکردگی کو اگلے الیکشن میں پیش کرکے ووٹ لیتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس بات کا شعور نہ عوام کو ہے نہ سیاسی جماعتوں کو اپوزیشن کا اصل کام کیا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اپوزیشن کا مطلب تو سیاسی ہنگامہ آرائی اور مخالفت برائے مخالفت کے سوا کچھ نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اس رویے کو بدلا جائے اور عوامی فلاح پر مبنی قانون سازی کو اپوزیشن اپنا مسئلہ بنائے۔

دوسری گزارش ن لیگ اور خاص کر مریم بی بی کی خدمت میں کہ مسلم لیگ کے تمام تر مستقبل کا انحصار ان ہی کے فیصلوں پر ہے۔ مسلم لیگ کو اگر ایک حقیقی سیاسی جماعت کے طور پر زندہ رہنا ہے تو مریم بی بی کا اس میں بنیادی کردار ہوگا۔ مسلم لیگ کی قیادت میں وہ واحد ہستی ہیں جن پر براہ راست کرپشن کا کوئی حقیقی الزام نہیں۔ وہ اگر کوئی سمجھوتہ کرنے کے بجائے جیل میں رہنا پسند کرلیں تو مستقبل انھی کا ہے۔ وہ اطمینان رکھیں کہ اس کے لیے انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ ورنہ دوسرا راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس راستے پر چل کر ان کی منزل تو انھیں قریب سے مل جائے گی۔ البتہ ملک وقوم کی منزل بہت دور جا پڑے گی۔

پیپلز پارٹی سے گزارش ہے کہ خدارا سندھ کو مفتوحہ علاقہ نہ سمجھیں۔ مراد علی شاہ ایک بہتر حکمران ہیں۔ ان کو مکمل اختیار دیں۔ وہ اس صوبے کو رول ماڈل بنا کر دوبارہ پورے پاکستان میں اپنے قدم جما سکتے ہیں۔ وگرنہ دوسری صورت میں لیاری کی طرح باقی سندھ سے بھی ان کے قدم اٹھا دیے جائیں گے۔

مذہبی جماعتوں سے صرف اتنی درخواست ہے کہ مذہب کے نام کے بجائے مذہب کی تعلیم کو اپنا مسئلہ بنائیں۔ لوگ آپ کی شکل میں صحابہ کرام کے کردار کو دیکھیں۔ اس کے لیے اپنے کارکنوں میں سے سیاسی ذہن رکھنے والوں کی کردار سازی پر توجہ دیں۔ سیاست سیاستدان کا کھیل ہے۔ سیاستدان صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ صاحب کردار بھی ہو تو اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ ہم آپ سے اسی کی توقع رکھتے ہیں کہ آپ صاحب بصیرت بھی ہوں گے اور صاحب کردار بھی۔

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعثِ زحمت نہیں، باعثِ رحمت بن کر رہیے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمد محمود مرزا

جو ملا ہے اس کی قدر کریں

صبح کو جب ہم اٹھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اپنے اطراف میں موجود روشن دنیا کو دیکھنے کے لیے کھل جاتی ہیں اور ہمارے کان اردگرد پائی جانے والی تمام آوازوں کو سننا شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ نابینا اور قوتِ سماعت سے معذور افراد اس صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔

رات کو جب ہم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹتے ہیں تو گہری اور پرسکون نیند ہمیں لطف اندوز کرنے کے لیے تیّار رہوتی ہے۔ جبکہ بے خوابی کے مریضوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔

شام ہوتے ہی ہم غذائیت اور ذائقہ سے بھرپور کھانے کو اپنے دستر خوان کی زینت بناتے ہیں۔ جبکہ بے شمار مفلس اور نادار لوگ ان نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں۔

جب ہمیں پیاس لگتی ہے تو پینے کا صاف پانی ہمیں باآسانی میسر ہوتا ہے۔ جبکہ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کو پانی بھر کر لانے کے لیے میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔

جب ہمیں نئے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم بازار جاتے ہیں اور اپنی پسند کے ملبوسات خرید کر لے آتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگوں کو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سالوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

جب ہمیں نیند آتی ہے تو ایک نرم و ملائم بستر ہمارے آرام کے لیے دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن ان کے پاس یہ بستر نہیں ہوتا جو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔

جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو فوراً ایک اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ ایسا نہیں کر سکتے جن کے پاس ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی۔

جب ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اسکول جائیں تو ہم ان کا داخلہ اچھے سے اچھے اسکول میں کرادیتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے لیے ایسا ممکن نہیں ہوتا جن کے پاس اپنے بچوں کو

پڑھانے اور اسکول بھیجنے کا کوئی ذریعہ اور کوئی امید نہیں ہوتی۔

تاہم ہمارے پاس بے شمار ایسی نعمتیں ہوتی ہیں جن میں ہم گھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جن نعمتوں کو ہم فار گرانٹڈ لے رہے ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے کوئی جدوجہد نہیں کی ہوتی، بلکہ یہ نعمتیں تو خالصتاً ہمارے خالق کی طرف سے ہمارے لیے ایک تحفہ ہوتی ہیں۔

آیئے ہم سب مل کر ہمارے پاس موجود تمام نعمتوں پر غور کریں، ان کے لیے اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کریں اور جو ملا ہے اس کی قدر کریں۔

پنجرے میں قید پرندے

وہ چھوٹے چھوٹے پَر جن کا کام آسمان کی بلندیوں کو چھونا اور فضاؤں کی سیر کرنا تھا۔ افسوس کہ انسانوں نے ان کو محض اپنے لطف اور تفریح کی غرض سے قید کرلیا۔ کیا یہ ظلم اور خود غرضی نہیں ہے؟

کیا ہوگا اگر ہم انسانوں کو ہمارے اپنے ہی گھر میں ہمیشہ کے لیے قید کرلیا جائے اور باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے؟ اس پر ہمارا ردِعمل کیا ہوگا؟ گھر کی اس قید پر ہم کیسا محسوس کریں گے؟ ان سوالات کا جواب دینے میں کسی حساس انسان کو کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔

یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہمارے پالتو جانوروں کا ماحول کم و بیش ویسا ہی ہو جیسا ان کا طبعی مسکن ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں کا قدرتی ماحول ان کے لیے ان کے گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم ان کو اس ماحول سے محروم رکھتے ہیں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی جائے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ اگر ہم ان کو ویسا ہی ماحول مہیا نہیں کرسکتے تو ہم ان کو نہ رکھیں۔

مولانا تہامی بشر علوی

میں کس جماعت کا ہوں؟

جس ذہن کو زندگی میں کبھی اپنی انفرادی شخصیت کا تجربہ نہ ہو پایا ہو، اس کے لیے یہ تصور قریباً ناممکن ہی ہو جاتا ہے کہ کسی شخص کا غیر جماعتی وجود کیسے ممکن ہے؟ پھر جہاں خود فراموشوں کی اک اچھی خاصی تعداد آباد ہو چکی ہو، وہاں فرد کی کسی انفرادی حیثیت کا ادراک بھی ممکن نہیں رہتا۔اب معاملہ سیاسی ہو یا مذہبی لوگوں کے دیکھنے کا انداز یوں بن جاتا ہے کہ ''کون کس جماعت کا ہے؟'' برسوں سے ایسی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا لوگوں کے لیے کسی انسان کو ''صرف فرد'' کی حیثیت سے دیکھنا ناممکن ہی ہو جاتا ہے۔

چنانچہ وہ جب کسی مذہبی یا سیاسی معاملہ پر کسی کے خیال کو جانتے ہیں تو ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ کہی گئی بات کیا ہے اور وہ کس دلیل پر کہی جا رہی ہے۔ایسے میں ذہن جاتا بھی ہے تو اس طرف ہی جاتا ہے کہ جس معاملہ میں کوئی بات کہی گئی ہے وہ کس جماعت کے حق میں کہی گئی ہے۔اب اگر وہ بات ان کی اپنائی گئی کسی جماعت کے حق میں محسوس ہو تو وہ سمجھنے کے تکلف کے بغیر ہی تائید کریں گے اور اگر بات ان کے جماعتی تعصّبات کے مطابق محسوس نہ ہو رہی ہو تو بن سمجھے مخالفت پر اتر آئیں گے۔ایسے ذہنی ماحول میں کوئی بات اپنی ذات میں درست یا غلط نہیں ہوتی بلکہ کسی جماعتی عصبیت کی بنیاد پر رد یا قبول ہوتی ہے۔فلاں بات قبول ہے، اس دلیل کے ساتھ کہ وہ میری جماعت کے حق میں ہے، جبکہ فلاں بات رد ہے اس لیے کہ وہ دوسری جماعت کے حق میں کیوں ہے؟

اس روش پر جینے والے انسانوں کی عقلی زندگی مکمل تباہ ہو جاتی ہے۔ایسی زندگی میں زندگی کے نام پر جو چیز بچ پاتی ہے اسے جذباتی زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ زندگی پھر ''کنٹرولڈ بائی

مائنڈ'' ہونے کی بجائے ''کنٹرولڈ بائے ایموشنز'' ہوتی ہے۔ یہ زندگی ''ریزن بیسڈ'' ہونے کی بجائے ''ایموشن بیسڈ'' ہو جاتی ہے۔ایسے افراد چوں کہ ذاتی زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں، اس لیے وہ اپنے وجود کے احساس کے لیے کسی نوعیت کی جماعتی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عقلی زندگی تباہ ہو جانے کے بعد وہ کسی جماعت سے کوئی عقلی وابستگی بھی نہیں رکھ پاتے۔ وہ کسی جماعت سے وابستگی بھی جذباتی بنیادوں پر رکھ پاتے ہیں۔

ایسی زندگی کے پھر اپنے لوازمات ہوتے ہیں جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ البتہ ایسی جذباتی زندگی کا ایک اہم وصف یہ ہوتا ہے کہ جلد ہی پرستش کے جذبات میں ڈھل جاتی ہے۔ اسے جو ماننا ہوتا ہے کسی بے عیب معبود کی طرح ماننا ہوتا ہے اور پورا ماننا ہوتا ہے۔اور جسے رد کرنا ہوتا ہے مکمل رد کرنا ہوتا ہے۔اس نوعیت کی جذباتی کیفیات جس قسم کا نفسیاتی مزاج تشکیل دیتی ہیں اسے ''ردِّ کل یا قبول کل'' کی نفسیات کہا جا سکتا ہے۔

پرستش کے جذبات عشق کے جذبات ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔اپنی معشوق جماعت یا فرد کو مکمل قبول کرنا ایسے فرد کی مجبوری بن جاتا ہے۔وہ اپنی جماعت کی معمولی خوبیوں کو غیر معمولی ثابت کرے گا اور خامیوں کی تاویل کر کے جماعت سے عشق نبھائے گا۔ یہیں پر بس نہیں وہ ہر فرد سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کی معشوق جماعت سے وابستہ ہو اور اسی عشق کے ساتھ وابستہ ہو جس میں وہ مبتلا ہے۔ دوسروں سے وابستگی کی ایک سطح عقلی بھی ہوتی ہے۔ اس وابستگی کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ ایسا انسان کسی جماعت یا فرد سے وابستہ ہونے کے بجائے اس جماعت یا فرد کی خوبیوں سے وابستہ ہوتا ہے۔اسے کوئی خوبی اپنی وابستگی کے دائرے سے باہر بھی مل رہی ہو تو بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔اس نے چوں کہ اپنی اپنائی گئی شخصیت یا جماعت کی پرستش نہیں کرنی ہوتی اس لیے اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی جماعت یا شخصیت کی بعض چیزیں قبول کر لے

اور بعض رد کر دے۔ اسے اپنے وجود کے احساس کے لیے کسی غیر میں ضم ہو جانے کی مجبوری لاحق نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ کہیں ضم ہو کر اسے معصوم باور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کا ممدوح مجروح ہونے سے اس کی اپنی شخصیت مجروح نہیں ہوتی۔ وہ کہیں منسلک ہو کر بھی اپنے انفرادی وجود سے محروم نہیں ہو جاتا۔ اس کے ہاں رد و قبول کا معیار کوئی دلیل ہوتی ہے نہ کہ کوئی جذباتی وجہ۔ اس کے برعکس عقلی وجود سے محروم، ''ردِ کل یا قبول کل'' کے مزاج کا حامل فرد اپنی انفرادی ذات کو کسی غیر میں مکمل ضم کر لیتا ہے۔ وہ اس خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کے ممدوح کی خوبیاں گویا اس کی خوبیاں ہیں اور اس کے ممدوح پر نقد گویا اس پر نقد ہے۔ بلکہ وہ غیر چونکہ اس کا قائم مقام معبود ہے اس لیے اسے بے عیب دیکھنا اور دکھانا اس کا جذباتی تقاضا بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہی اپنی شخصیت کو فنا کر کے ''جیالے'' کے روپ میں ظہور کر لیتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا فرد اپنی انفرادیت کو فنا کر کے ایک قسم کی غیر زندگی جی رہا ہوتا ہے۔

جس سماج میں انفرادی زندگی سے محروم کثرت میں ہوں تو وہاں انفرادی زندگی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی ایسی انفرادیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جسے کسی بھی نوعیت کی اجتماعیت کی تائید حاصل نہ ہو۔ ایسے سماج کا فرد اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ ''آپ کسی مسئلہ پر کس طرح سوچتے اور کیا رائے رکھتے ہیں۔'' کسی رائے کو جاننا اس کی دلچسپی میں شامل ہی نہیں ہوتا۔ اس کا سوال شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ ''آپ کس جماعت سے ہیں یا آپ کس جماعت کی تائید کرتے ہیں۔'' گویا سائل یہ فرض کر چکا ہے کہ یہ تو طے ہے کہ کسی جماعت کا ہونا ضروری ہے بس یہ واضح کر دیا جائے کہ آپ کی جماعت کون سی ہے۔

میں ذاتی طور پر کسی انفرادیت کش اجتماعیت کے تصور کا قائل نہیں ہوں، اس لیے اس سوال کو اپنے سے متعلق نہیں پاتا۔ میری دلچسپی کسی زیرِ بحث مسئلہ پر درست تر رائے تک پہنچنا ہوتی

ہے نہ کہ کسی جماعت یا فرد کی تائید یا تردید۔میں ایسی اجتماعیت افوڈ نہیں کر سکتا جو میری انفرادیت کی قاتل ثابت ہو۔

میرے ہاں اجتماعیت کا جو تصور انسانوں کے لیے موزوں بلکہ ناگزیر ہے،اس طرح کی اجتماعیت ہماری مذہبی یا سیاسی جماعتوں میں فی الحال موجود نہیں۔جس طرز کی اجتماعیت کا روپ ہماری مذہبی و سیاسی جماعتوں نے دھار رکھا ہے اس سے وابستگی کی کم از کم شرط بھی،شرفِ انسانی سے محرومی ہے جس کی مجھ بشر ذات میں تاب ہی نہیں۔انھی مجبوریوں کی وجہ سے میں کسی جماعت کو مکمل طور پر نہیں اپنا سکتا۔

اس تفصیل کے بعد خلاصہِ کلام یہ ہوا کہ،''الحمد للہ میرا عقلی وجود چونکہ ابھی سلامت ہے۔ میں کسی جماعت کا حصہ اپنے عقلی وجود کے ہمراہ ہی بن سکتا ہوں۔جس کا تقاضا یہ ہو گا کہ جماعتوں کے منشور اور پالیسی میں میری رائے کی پوری اہمیت ہو۔ مجھے حق حاصل ہو کہ جماعت کے منشور یا پالیسی سے اختلاف کر سکوں۔چونکہ موجودہ مذہبی یا سیاسی جماعتوں میں عقلی وجود کے ہمراہ شمولیت ممنوع ہے۔یہ تمام جماعتیں درحقیقت ''عقل فری جیالوں کا کلب'' بنی ہوئی ہیں۔ میں چوں کہ انسان ہوتے ہوئے جیالہ نہیں بن سکتا۔سو اس لیے کسی جماعت کا باقاعدہ رکن بننے سے معذور ہوں۔میرے لیے ایسے میں جو ممکن ہے وہ یہی کہ جس جماعت میں جو اچھائی موجود ہو اس کا اعتراف کرلوں اور جس کی جس پالیسی سے اختلاف ہو وہ بھی کر گزروں۔یہ ممکن ہے ایک مسئلہ میں ایک جماعت کا موقف درست ہو اور دوسرے مسئلہ میں دوسری جماعت کا۔ میں چونکہ جماعتی امور میں ''ایموشن بیسڈ'' اپروچ کا حامل نہیں ہوں اس لیے میرا معیار ''اپنی جماعت کا فیور'' نہیں ہے۔لہذا میں ''درست اور غلط'' کے معیار کو سامنے رکھ کر کسی مسئلہ پر اظہار خیال کیا کرتا ہوں۔جب آپ کو یہ محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ کل میں نے ایسی بات کہی جو آپ کی جماعت

کے فیور کی ہے اور پھر کوئی ایسی بات کہی جو اس کے فیور میں نہیں ہے تو یہ نہ سوچا کیجیے کہ میں کل آپ کی جماعت کا تھا اور آج کسی اور جماعت کا ہو گیا۔ بس اتنا سوچ لیا کیجیے کہ جہاں آپ کی جماعت کی تائید کی گئی وہاں اس کا موقف درست تھا اور جہاں تائید نہ کی گئی وہاں میری رائے میں اس کا موقف درست نہ تھا۔ میں چوں کہ جیالہ نہیں ہوں اس لیے کسی جماعت کے بارے میں ''قبولِ کل'' کی نفسیات مجھ میں نہیں ہیں۔ اگر آپ بھی اپنا عقلی وجود تحلیل کر لینے کے بعد کسی جیالے کی سی زندگی جی رہے ہیں تو یہ بات بھی آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ ایسے میں آپ بھی مجبور اور میں بھی مجبور۔ امید ہے سوال کا جواب ہو گیا ہو گا''۔

ہمایوں مجاہد تارڑ

جیسے کسی جنگل میں پڑا ایک چھلاّ (ring)......

یہ سیارہ زمین ہے۔ایک عام آدمی کے وجود کے مقابل جس کا حجم تقریباً 20 ارب گُنا بڑا ہے۔اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور پھر دوسری طرف سے گھوم کر واپس اسی مقام تک کا کل فاصلہ 40 ہزار کلومیٹر ہے، یعنی اس کا کل دائرہ جسے circumference کہا جاتا ہے۔ بیچ میں جنگل، دریا، پہاڑ، سمندر اور ہیبت ناک وسعتوں کے حامل ریگستان حائل ہیں۔اب بھی ایسے مقامات ہیں جہاں انسانی قدموں کی چاپ نہیں سنی گئی۔ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر پاس پڑوس کے کسی ملک تک کا فضائی سفر بھی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت طلب کرتا ہے۔ ذرا سا آگے جاؤ، جیسے تھائی لینڈ یا کوالا لمپور یا سنگاپور تک کا سفر درپیش ہو تو سفری مدّت 8 سے 10 گھنٹوں تک پھیل جاتی ہے کہ مسافت بھی تقریباً 5 ہزار کلومیٹر تک طویل ہو جاتی ہے۔تاہم، حیرت ہے کہ ایسی وسعتوں اور فاصلوں کا حامل سیارۂ زمین جو نظامِ شمسی میں اپنے پڑوسی سیاروں عطارد، زہرہ اور مریخ سے بڑا ہے، مضحکہ خیز حد تک باقی اجسامِ فلکی سے چھوٹا ہے۔ سیارہ مشتری میں اس جیسی 13 زمینیں سما جائیں۔ جبکہ سورج میں ایسی 13 لاکھ زمینیں سما جائیں کہ وہ چار ملّین یعنی 40 لاکھ کلومیٹر کا دائرہ لیے زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔سورج کا ڈائیا میٹر ہی دیکھ لیں یعنی دائرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا فاصلہ تو وہ ہماری زمین کے ڈائیا میٹر سے 109 گنا بڑا ہے۔ ہمارے سولر سسٹم کا یہ عظیم الجثہ ستارہ یعنی آفتاب ہماری زمین سے 3 لاکھ تینتیس ہزار گنا زیادہ وزنی ہے۔ اِس پر بھی بس نہیں۔ وہ 150 ملین کلومیٹر کی مسافت پر کھڑا ہے!

یہ زمین ہے جہاں اربوں کی تعداد میں موجود نسلِ آدم آج اپنا جیون یوں گزارتی ہے کہ ایک فرد کو اپنی گلی اور محلے سے ذرا پرے جھانکنے کو ٹیلی ویژن سکرین کا سہارا چاہیے، یا اُسے ایک موٹر گاڑی میں بیٹھ کر عازمِ سفر ہونا پڑتا ہے۔ ملتان سے لاہور، اور لاہور سے اسلام آباد یا پشاور

تک کی مسافت کے لیے وہ ''طویل مسافت'' ایسے الفاظ بولتا ہے۔ یہاں کے زمانی فاصلے بھی ہمیں بڑے طویل دِکھتے ہیں کہ ہم آہ بھر کر 'لانگ لانگ ٹائم اَگو' ایسے الفاظ منہ بھر بھر انڈیلا کرتے ہیں جب یہ کہنا چاہ رہے ہوں کہ پچیس یا پینتالیس برس پہلے یا چلیں 5 یا 8 صدیاں پہلے فلاں واقعہ ہوا تھا۔ ہزاروں مذاہب، تمام معیشت، قوموں کے ہیروز، انسانیت کے قاتل، تمام بادشاہ، تمام غربا جن کا کبھی کوئی وجود تھا یا اب ہے، ورلڈ کپ ایسی رونقیں، عالمی جنگ ایسے ہوشربا واقعات، سیلاب، زلزلے، آفات۔۔۔ سب اسی زمین پر برپا ہیں جن کی یادداشتیں سمیٹے یہاں لاکھوں کتابیں بھی جمع ہیں۔ زندگی کا ایسا حیرت ناک حجم! اور ہاں تیز رفتار سوپر سونک طیارے بھی اسی زمین پر رہ رہ کر اڑانیں بھرا کرتے ہیں۔

تاہم، دنیا میں سب سے تیز رفتار روشنی کی رفتار ہے جو 3 لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کرتی ہے۔ یہ رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ اس حساب سے ہم زمین کے گرد ایک سیکنڈ کے مختصر ترین عرصہ میں 7 چکر لگا سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اسی رفتار سے ایک پورا سال سفر میں رہیں تو اسے وَن لائٹ year یا ایک نوری سال کہا جاتا ہے۔ ہماری زمین سے قریب ترین ستارہ سورج ہے جو 150 ملین کلومیٹر دور ہے۔ دوسرا قریب ترین ستارہ ایلفا سنطوری ہے، یعنی جو سورج سے بھی قریب ترین ستارہ ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ 4 اعشاریہ 22 نوری سال ہے۔ ہمارے سورج کے حجم سے کئی گنا بڑے ستارے نہ صرف دیکھے جا چکے بلکہ اُن سب کے نام بھی رکھے جا چکے، اور اُن کے خواص وغیرہ بھی خوب ذمہ داری وسنجیدگی سے سٹڈی کیے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں، اب تک قابلِ مشاہدہ کائنات میں جو ستارے دریافت ہوئے ہیں، اُن میں سب سے بڑا ستارہ وی وائے کینس میجورس VY Canis Majoris ہے۔ اس کا ڈائیا میٹر ہمارے سورج کے مقابلہ میں دو ہزار گُنا زیادہ ہے، یعنی ایسے ہزاروں سورج اس میں سما جائیں۔ زمین سے VY Canis Majoris تین ہزار نوسو (3,900) نوری سال کی مسافت پر ہے، یعنی وہاں تک پہنچنے کو ہمیں کائنات کی عمر سے بھی کئی گنا زیادہ وقت درکار ہوگا، جبکہ کائنات

کی کل عمر تقریباً 14 ارب سال ہے۔

لیکن ذرا ٹھہریے۔ دم بھر کو سانس بحال کر لیجیے۔ ابھی تو کائنات کا سفر شروع ہی نہیں ہوا۔

اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سیارہ زمین باقی کے 7 سیاروں کے ہمراہ سورج کے گرد اگرد چکر لگانے میں مصروفِ عمل ہے۔ اِسے ہم نظامِ شمسی یا سولر سسٹم کا نام دیتے اور ایک چھوٹا سا خاندان کہا کرتے ہیں۔ تاہم، ہمارا یہ خاندان کسی محلّے کی ایک ذیلی یا چھوٹی گلی کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا پورا محلّہ وہ کہکشاں ہے جسے مِلکی وے milky way کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری اس کہکشاں میں اب تک دریافت ہونے والے ایسے ہی سولر سسٹمز کی کل تعداد 500 ہے، یعنی جو قابلِ مشاہدہ ہے۔ جبکہ یہ تعداد ہر سال بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ماہرینِ فلکیات اب اندازہ لگانے کی پوزیشن میں آ چکے ہیں، اور ان کا کہنا ہے کہ آثار وقرائن کے مطابق صرف اس ایک کہکشاں میں اربوں سولر سسٹمز ہیں۔ ایک ویب سائٹ پر لکھا ہے 100 بِلّین یعنی ایک سو ارب سولر سسٹمز ہو سکتے ہیں۔ جبکہ یہی سوال اگر آپ سیدھا سیدھا گوگل کر لیں کہ مِلکی وے میں کتنے سولر سسٹمز ہیں تو کھٹاک سے موصول ہونے والا جواب یہ ملتا ہے 200 ارب سولر سسٹمز۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک اور اہم بات ان اجسامِ فلکی کے بیچ حائل طویل مسافتیں ہیں۔ اس کہکشاں کے اندر فاصلے اس قدر طویل ہیں کہ بالفرض ہم اگر ایک ایسی گاڑی میں سوار ہو جائیں جو ایک سیکنڈ میں 3 لاکھ کلومیٹر کی رفتار سے بھاگ سکتی ہو تو ہمیں اِس کہکشاں سے باہر نکلنے کو ایک لاکھ سال سفر میں رہنا ہوگا۔ یقیناً یہ فاصلہ دماغ کو چکرا دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر خلا کا سفر تو ابھی شروع ہوا ہے۔

ہماری مِلکی وے کہکشاں سے بھی بڑی ہماری پڑوسی کہکشاں ہے جس کا نام Andromeda Galaxy ہے۔ یہ ہماری مِلکی وے سے دو گنا بڑی ہے یعنی اس کی چوڑائی دو لاکھ نوری سال جتنی وسیع وعریض ہے۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں! چونکہ اس سے کچھ آگے M 8 Galaxy نامی کہکشاں ہماری کہکشاں سے 7 گنا بڑی ہے۔ اِس سے آگے آئی سی وَن

وَن زیرو وَن IC 1101 نامی کہکشاں ہماری کہکشاں سے 600 گنا بڑی ہے۔

جیسے ستاروں سے مل کر کہکشائیں بنتی ہیں، اسی طرح کہکشاؤں سے مل کر کلسٹرز clusters وجود پاتے ہیں۔ اب جس کلسٹر میں ہماری کہکشاں موجود ہے اسے لوکل کلسٹر یا لوکل گروپ Local Group کا نام دیا گیا ہے، اور اس میں ایسی کُل 54 کہکشائیں ہیں۔ مگر کائنات کی وسعت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کلسٹرز بھی آپس میں مل کر سوپر کلسٹرز super clusters بناتے ہیں۔ جِس سُوپر کلسٹر میں ہم رہتے ہیں، اسے ورگو کلسٹر Virgo Cluster کہتے ہیں۔ اور اس میں تقریباً 100 کلسٹرز موجود ہیں۔ اس ورگو کلسٹر کی چوڑائی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، ایک سو دس مِلّین نوری سال 110 million light year wide ہے۔ سب سے بڑا سُوپر کلسٹر جو اب تک دریافت ہوا اُس کا نام لیانکا سُوپر کلسٹر Liankea Super Cluster ہے۔ یہ ایک لاکھ کہکشاؤں پر مشتمل ہے۔ اور اس کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا فاصلہ 520 مِلّین نوری سال ہے۔

بات یہاں پر بھی ختم نہیں ہوتی۔

اس سے آگے بڑھیں تو وہ تصاویر جو کائنات کے مجموعی حجم اور ان کلسٹرز کے گروپ فوٹوز لینے پر فوکسڈ ہیں، اُن میں یہ لیانکا نامی کلسٹر بھی ریت کے ایک ذرّے جتنا نظر آتا ہے۔

یہ سب کچھ کائنات کا وہ حصہ ہے جسے مشاہداتی یا قابلِ مشاہدہ یا observable universe کہتے ہیں۔ ایسٹرانومرز اپنی طاقتور ٹیلی سکوپس کی مدد سے اور خلا میں چھوڑے گئے سیٹیلائٹس کی مدد سے جو تصویریں اتار کر ویب سائٹوں پر ڈال رہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات ایسے اربوں سُوپر کلسٹرز پر مشتمل ہے جو ہمیں دور سے بس چھوٹے چھوٹے نقطوں کی صورت نظر آتے ہیں۔ یعنی کھربوں کہکشائیں ہیں جن کی تعداد کا بس اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کا جو حصہ اب تک دریافت ہو چکا، وہ ایک فیصد کا ہزارواں حصہ بھی نہیں بنتا۔ مگر یہ بھی کس قدر زیادہ ہے، اِس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا لیں کہ اس کا درمیان سے ہر ایک سائیڈ

کافاصلہ 93 بلّین نوری سال 93billion light year wide ہے۔

اس دریافت شدہ حصّے سے آگے کیا ہے، ہم نہیں جانتے۔ نہ شاید کبھی جان پائیں۔ چونکہ اس observable universe سے دور روشنی کو ہماری زمین تک پہنچنے کے لیے خود ہماری زمین کی کل عمر سے بھی کہیں زیادہ وقت درکار ہوگا۔ چنانچہ یہ کسی طور ممکن نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کائنات ہر لمحہ مزید پھیل رہی ہے کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون۔

لہٰذا جو فاصلہ آج ہم ایک نوری سال سمجھ رہے ہیں وہ اگلے چند لمحوں میں دوگنا ہو چکا ہوگا۔ قابل مشاہدہ کائنات سے آگے کی کائنات ہمارے تصور کی ہر ممکنہ حد سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ theory of cosmic inflation جو ڈاکٹر Alan Guth نے پیش کی، اس کے مطابق اصل کائنات دریافت شدہ کائنات کے مقابلہ میں 150 sextillion time زیادہ ہے۔

یہ تفصیل پڑھ کر رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ بھی یاد کیجیے جو 14 سو برس پیشتر اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا کروائے تھے کہ سات آسمانوں کی حیثیت خدا کے اقتدار کی کرسی مقابلے میں ایسی ہے جیسے ایک بیابان زمین میں کوئی چھلاّ (ring) پڑا ہو، (السلسلۃ الصحیحۃ، رقم 109)۔ بس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں زمین و آسمان کی بادشاہی ہے۔ کچھ اندازہ ہوا آپ کو کہ جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں تو اصلاً اس کا مطلب کیا ہے؟

ناقابلِ تصور بات ہے کہ جس ہستی نے ایسی وسیع کائنات بنائی، وہ داستانِ حیات کو یہیں ختم کر دے۔ کتابِ مقدّس کے اوراق پکار پکار کر کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ یہ کہ تُم لوگ ایک دارالامتحان میں قید کیے گئے ہو تا کہ ہم دیکھیں کہ کون ٹریلین آف ایئرز پر مشتمل اُس لافانی حیات کا وارث بنتا ہے۔ انسانی دماغ کے کُل 5 سے 7 فیصد سیلز استعمال ہوتے ہیں ایک لائف ٹائم میں۔ مقامِ فکر ہے کہ باقی کے 90 فیصد سیلز آخر کیوں بنائے گئے؟ اس دنیا کی زندگی ایک عارضی پڑاؤ ہے۔

خالق کا پیغام یہ ہے کہ قبر کے ایئرپورٹ سے ہم لوگ جو اڑان بھرتے ہیں تو لامحدود کائنات میں رکھی بے حدوحساب زندگی کی جانب کُوچ کر جاتے ہیں۔ لازم ہے کہ اس خدا سے اپنا رشتہ محبت کی بنا پر استوار کیا جائے، نہ کہ خوف و دہشت کو پیمانہ بنایا جائے۔ اسے ہماری عبادات اور نیکیوں کی ہرگز کوئی حاجت نہیں۔ وہ مالک الملک اتنا بڑا اور طاقتور ہے کہ یہ فلکی اجسام اس کی نظر میں معمولی کھلونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے ایک معروف سکالر نے کیا خوب کہا:

''خدا سے آپ نے کیا ڈرنا؟ کوئی صورت نہیں بنتی خدا سے ڈرنے کی کہ آپ کا اُس کے ساتھ کوئی موازنہ ہی نہیں بنتا۔ تقویٰ کا صرف ایک مطلب ہے کہ خدا سے محبت میں ایسے کاموں سے دور رہو جو تمہیں اس سے دور کردیں۔ اس کے علاوہ تقویٰ کا اور کوئی مطلب نہیں۔ اگر تم یہ کہو کہ میں خدا سے بہت ڈرتا ہوں تو یہ تمہارا اپنا guilt ہے۔ اللہ تو اتنا بڑا، غالب اور محیط ہے کہ وہ سورج کو چراغ کہتا ہے۔ ڈیڑھ سو میل لمبے asteroid کو پتھر کہتا ہے کہ چھوٹا سا روڑا پھینک دوں تم پر تو تم ختم ہو جاؤ۔ اتنے بڑے اللہ کے ساتھ وحشت کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا، خوف کا نہیں ہو سکتا۔ مر جاؤ گے ڈر ڈر کر۔ بس محبت کرو اس سے۔ انس رکھو اللہ سے۔ پیار کرو۔ وہ یہی چاہتا ہے۔''

اس عارضی قیام کو کُل حیات سمجھ بیٹھنا ایک بڑی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ حضرتِ اقبالؒ نے اس پیغام کو یوں sum up کیا ہے:

موت کے ہاتھوں سے مِٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

شفقت علی

کامیابی کے اصول

آج کل نوجوانوں میں آرٹ آف لائف مینجمنٹ کی کتابیں پڑھنے اوران موضوعات پر مقررین کو سننے کا بہت رواج ہے۔ یہ مصنفین اور مقررین اپنے قارئین اور سامعین کو متحرک کرنے کے لیے اکثر دلچسپ فرضی یا حقیقی کہانیاں بھی سناتے ہیں۔کبھی ابراہم لِنکن کے ایک ناکام سیاستدان سے کامیاب صدر بننے تک کی کہانی تو کبھی بل گیٹس کے ارب پتی بننے کی داستان۔اسٹیفن ہاکنگ جیسے معذورلوگوں کوبھی ہمت وحوصلہ کےنمونہ کےطور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اپنی دماغی صلاحیتوں کا بہترین استعمال سیکھیں۔

بلاشبہ ان لوگوں کا مقصداورنیت بہت اچھی ہے مگرایک تو اِن کے ہاں کامیابی کامفہوم صرف دنیاوی کامیابی تک محدود ہےاور دوسرے یہ کہ عام انسانوں کو ہمارے سامنے بطوررول ماڈل پیش کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس انسان کی اصل کامیابی کا معیارصرف دنیا ہی نہیں بلکہ آخرت بھی ہے۔اس لیے پیغمبروں کی حیاتِ طیبہ کومدِ نظر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

اس حوالے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ سے کچھ جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں۔

1۔ حضرت یوسف کوبچپن میں ان کے حاسد بھائیوں نے مرنے کے لیےاندھیرے کنویں میں پھینک دیا۔مگرآپ پریشان اور مایوس نہ ہوئے بلکہ اللہ کی مشیّت پرصبراوربھروسہ کیا،بہتری کی دعا کی اورامید کا دامن نہ چھوڑا۔بالآخراللہ نے آپ کی مددفرمائی اورکنویں سے باہرنکال لیے گئے۔

2۔ اب جس قافلہ نے انہیں کنویں سے باہرنکالا تھااسی نے آپ کوعزیزِمصر کے ہاتھ بطورغلام بیچ دیا۔آپ کی آزادی کوغلامی میں بدل دیا گیامگرافسوس یاشکوہ کی بجائے آپ نے صبرفرمایااور عزیزِمصرکی خدمت اس انداز میں کی کہ اس نے آپ کواپنامنہ بولا بیٹابنالیا۔

3۔ عالمِ شباب میں زلیخانے آپ پرڈورے ڈالنے چاہےمگرآپ نے اپنی عفت وحیاپرآنچ نہ

آ نے دی۔ ردِعمل میں اس نے آپ کو جیل تک بھجوا دیا مگر آپ نے اس حادثہ کو بھی مالک کی طرف سے آزمائش سمجھا۔ جیل میں عزیزِ مصر کی ناانصافی کا رونا رونے کے بجائے آپ اپنے پیغمبرانہ مِشن (دعوت) میں مصروف ہو گئے اور ساتھی قیدیوں کی تربیت کرنا شروع کر دی۔

4۔ جب آپ جیل سے باہر آئے تو دیکھا کہ مصر قحط کے بحران کے کنارے کھڑا ہے۔ اس کٹھن صورتحال میں آپ نے مصریوں کو اس بحران سے بچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

5۔ آپ ایک توحید پرست خاندان کے چشم و چراغ تھے مگر آپ کو مصر کے مشرکانہ ماحول کا سامنا کرنا پڑا۔ بجائے اس کے کہ آپ اس ماحول کا اثر لیتے یا وہاں سے کہیں دور چلے جاتے آپ نے اسی معاشرے کو اپنی فہم و فراست اور حکمت سے بدل ڈالا۔ یوں آپ نے کمال عقلمندی سے ایک مشرک معاشرے کو توحید پر جمع کیا۔

ان چند واقعات سے ہمیں پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ انسان کی زندگی اور مستقبل انسانوں کے ہاتھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ اور وہ لوگ جو مایوسی کے اندھیروں میں بھی اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ اُن کے بھروسہ کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ انسان اگر شکوہ و شکایت کی بجائے لوگوں کی خدمت کو اپنا مقصد بنا لے تو وہ بہت جلد معاشرے میں نمایاں مقام حاصل کر لیتا ہے۔

تیسرا اہم سبق یہ ہے کہ بامقصد لوگ اپنے مِشن کی تکمیل کے لیے زمان و مکان اور حالات کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی نظر ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنے مقصد پر مرکوز رہتی ہے۔

چوتھا سبق یہ ہے کہ ذہین لوگ بحرانی کیفیات سے نہ تو گھبراتے ہیں اور نہ ہی ان سے فرار حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنا ذمہ دارانہ کردار ادا کرتے ہیں۔

پانچواں سبق یہ ہے کہ قائدانہ صلاحیتوں کے حامل لوگ اپنے ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے خود ماحول کو متاثر کرتے ہیں۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (52)

حقوق باری تعالیٰ: روزہ اور اعتکاف

دین کے قانون عبادات میں سے ہم ابھی تک نماز، اور انفاق کا مطالعہ قرآن مجید کی روشنی میں کر چکے ہیں۔ یہ دونوں عبادات اپنی روح کے لحاظ سے بندگی کے پہلے بنیادی مظہر یعنی پرستش کا جان و مال کے پہلو سے علامتی اظہار ہیں۔ بندگی کا دوسرا مظہر اطاعت ہے۔ دین میں روزے اور اعتکاف کی عبادت اسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ ان میں سے پہلی عبادت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے جبکہ دوسری ایک نفل عبادت ہے۔

ماہ رمضان کے روزے

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی اس عظیم عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیا اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ اس مہینے کی وجہِ انتخاب بھی قرآن مجید نے خود بیان کی ہے کہ اس ماہ مقدسہ کی ایک مبارک شب یعنی لیلۃ القدر میں قرآن مجید جیسی عظیم کتاب کا نزول شروع ہوا۔ یہ رات اللہ تعالیٰ کی تکوینی اسکیم میں اہم ترین فیصلوں کے نزول کی رات ہے۔ جو خیر و برکات اس شب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترتے ہیں، وہ ہزار مہینوں میں اترنے والے خیر و برکات سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید یہی خیر و برکت لے کر نازل ہوا جس کا مقصد لوگوں کو جنت کی عظیم کامیابی سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کامیابی کا راستہ بندگی کی اس شاہراہ سے ہو کر گزرتا ہے جس کی طرف مکمل رہنمائی بھی خود قرآن مجید ہی کرتا ہے۔

تاہم قرآن مجید ایمان کے جس راستے کی طرف انسان کو بلاتا ہے اس پر چلنے کے لیے اپنے ہر تعصب سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ وہ اخلاق کی جس گھاٹی پر چڑھنے کی دعوت دیتا ہے، نفس انسانی کی ادنیٰ خواہشات اس راہ میں ہر دم مزاحمت تخلیق کرتی ہیں۔ چنانچہ اس راہ پر چلنے اور اس گھاٹی پر چڑھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان اصولی فیصلہ کر لے کہ کچھ بھی ہو اسے ہر حال میں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے۔ روزہ اسی مضبوط فیصلے کی تربیت کرنے کی ایک آسمانی تربیت گاہ ہے جو ہر سال گیارہ مہینوں کے بعد دہرائی جاتی ہے۔ یہ عبادت پورے ایک ماہ انسان کو یہ سبق سکھاتی ہے کہ زندگی کے ہر سرد و گرم اور روز و شب کی ہر کمی بیشی سے بے نیاز ہو کر ایک بندہ مومن خدا کی رضا کے لیے اپنی بنیادی ضروریات اور خواہشات تک بھی چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ پورے دن کھانے پینے سے رکنا اور تعلق زن وشو سے باز رہنا انسان میں یہ عزم پیدا کر دیتا ہے کہ کوئی ضرورت اور کوئی خواہش اسے خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ خدا کی حضوری میں جینے کا یہ احساس جو اس کی اطاعت پر آمادہ کرتا اور اس کی نافرمانی سے روکتا ہے، وہ تقویٰ پیدا کرتا ہے جس کے لیے روزے کی عبادت فرض کی گئی ہے۔

تقویٰ کے علاوہ رمضان کے روزوں کے دو مزید پہلو بھی قرآن مجید بیان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ روزہ رکھ کر انسان قرآن مجید سے ملنے والی اس نعمت ہدایت پر اللہ کی کبریائی بیان کرتا ہے جس نے جنت کی منزل کا نشان بھی انسانوں کو دکھایا اور اس پر چلنے کا واضح اور آسان راستہ بھی بالکل کھول کر رکھ دیا۔ جس خدائے عظیم کا یہ احسان ہے، اس کی بڑائی کا تقاضا ہے کہ انسان اس کے حکم پر بنیادی ضروریات بھی چھوڑ کر اس کی اطاعت اور بندگی کا آخری نمونہ پیش کرے۔ دوسرے یہ کہ روزہ رکھنا انسان میں شکر گزاری کا وہ احساس پیدا کرتا ہے جو خالی پیٹ اور خشک گلے کے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ محرومی کی یہی وہ حالت ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ

خدائے رحمٰن نے آسمان سے زمین تک ہر شے کو انسان کے کھانے پینے کی ضرورت کی تکمیل کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ چیز بندہ مومن کو آخری درجہ میں اس کے رب کا شکر گزار بناتی ہے۔

روزے کی اس عبادت کے ساتھ بندوں کو یہ موقع بھی دیا گیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو بطور نفل عبادت دنیا سے الگ تھلگ ہو کر خدا کے لیے مسجد میں معتکف ہو جائیں اور خود کو یاد الٰہی کے لیے وقف کر دیں۔ روزے کی پابندیوں کے ساتھ اعتکاف میں مزید یہ پابندی عائد ہو جاتی ہے کہ رات کے وقت بھی تعلق زن وشو سے رکا جائے۔ چنانچہ اعتکاف کی یہ عبادت روزے کے مقصد یعنی اللہ کی خاطر اس کی نافرمانی چھوڑنے کی آخری درجہ میں تکمیل کرتی ہے اور انسان کو آخری درجے میں اس کے رب سے قریب کرتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان کے آخری عشرے میں اس عظیم عبادت کی ادائیگی کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

دیگر روزے

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ ایک قدیم عبادت ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر میں روزے کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو چپ کا روزہ رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم شرائع میں جسمانی روزے کے علاوہ اس نوعیت کا روزہ بھی رکھا جاتا تھا جس میں انسان پر بات کرنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔

قرآن مجید روزے کو اہل ایمان کے ایک مستقل وصف کے طور پر بھی بیان کرتا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرض روزے رکھنے کے علاوہ نفلی روزے رکھنا بھی دین کے جمال وکمال کا ایک حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پہلو سے متعدد ایام میں نفلی روزے رکھے اور دوسروں کو بھی ان کی تلقین کی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید نے کسی غلطی کے ارتکاب یا کسی ذمہ داری کی عدم ادائیگی کی شکل میں کفارے کا جو قانون دیا ہے، روزہ اس کا بھی ایک اہم جز ہے۔ اس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندہ مومن کی ایمانی کیفیات پر کسی غلطی کے ارتکاب یا کسی ذمہ داری سے پیچھے رہ جانے کی صورت میں جو نفسیاتی اثر ہوتا ہے، روزہ اس کو دور کر کے دوبارہ اللہ سے قریب کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

قرآنی بیانات

''ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ اِس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں (کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں) تو اُن پر ہر روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے، اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے رہنما بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) سراسر ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُسے چاہیے کہ اِس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ (یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے۔ اور (فدیے کی اجازت) اِس لیے (ختم کر دی گئی ہے) کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، (اور جو خیر و برکت اُس میں چھپی ہوئی ہے، اُس سے محروم نہ رہو)۔ اور (اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا) اِس لیے (خاص کیا گیا ہے) کہ (قرآن کی صورت میں) اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر اُس کی بڑائی کرو اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار بنو۔'' (البقرہ 2: 183-185)

''(تم پوچھنا چاہتے ہو تو لو ہم بتائے دیتے ہیں کہ) روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم

سے درگذر کیا۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اُسے چاہو، اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری تمھارے لیے بالکل نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور (ہاں)، تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو (رات کو بھی) بیویوں کے پاس نہ جانا۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، سو اِن کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔''، (البقرہ 2 :187)

'پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ اور اگر کوئی آدمی معترض ہو تو اس سے اشارے سے کہہ دیجیو کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے روزے کی منت مان رکھی ہے تو آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔''، (مریم 19 :26)

''اور حج و عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ پس اگر تم گِھر جاؤ تو جو 'ہدی' میسر ہو وہ پیش کر دو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لیے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسر آئے۔ جس کو میسر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دوران حج میں رکھے اور سات دن کے روزے واپسی کے بعد۔ یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لیے ہے جن کا گھر در جوار حرم میں نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔''، (البقرہ 2 :196)

''اور کسی مومن کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے الّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پس اگر مقتول تمھاری دشمن قوم کا فرد ہو لیکن وہ بذات خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے تو خوں بہا بھی ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی۔ جس کو یہ استطاعت نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی توبہ ہے۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔''، (النساء 4 :92)

''تمھاری قسموں میں جو غیر ارادی ہیں ان پر تو اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن جن قسموں

کو تم نے پختہ کیا ہے ان پر مواخذہ کرے گا۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس معیار کا جو تم عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھ دے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تا کہ تم اس کے شکر گزار رہو۔''، (المائدہ5 :89)

''پس جس کو غلام میسر نہ آئے تو اس کے اوپر لگا تار دو مہینے کے روزے ہیں، ہاتھ لگانے سے پہلے اور جو اس کی طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس کے ذمہ۔ یہ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول پر تمہارا ایمان راسخ ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔''، (مجادلہ58: 4)

''اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ کرنا، اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اُس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے یا کفارہ دینا ہو گا، مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تا کہ وہ اپنے کیے کا وبال چکھے۔ جو ہو چکا اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔''، (المائدہ5: 95)

''اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں۔۔۔ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔''، (الاحزاب33: 35)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (56)

انقرہ، جو اس وقت ''انگورہ'' کہلاتا تھا، میں تیمور اور بایزید یلدرم کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں تیمور کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس طریقے سے تیمور نے سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا تھا مگر عثمانی کچھ ہی عرصے میں دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔

قلعے سے فارغ ہو کر ہم شہر کی طرف بڑھے۔ یہ انقرہ کا ''ضلع الوس'' تھا۔ ایک دکان سے موبائل کارڈ لینے کے بعد ہم اندر کی طرف آئے۔ ایک موڑ مڑتے ہی چوک کے بیچوں بیچ ایک قدیم مینار ہمارے سامنے تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مینار کا نام ''جولین مرتد کا ٹاور'' تھا۔ یہ ایک رومی بادشاہ تھا جو 360-363ء کے عرصے میں بادشاہ رہا تھا۔ اسے مرتد کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رومی سلطنت کو عیسائیت سے واپس قدیم مشرکانہ مذہب کی طرف لے جانے کی کوشش کی تھی۔ جولین سے پہلے روم کے بادشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر کے اسے ملک کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا۔

جولین مشرکانہ مذہب کے احیاء میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایران کی ساسانی سلطنت سے جنگ کے سلسلے میں جب وہ انقرہ سے گزرا تو اس کے پیروکاروں نے اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے یہ مینار تعمیر کیا تھا۔ اس مینار کو ترکی زبان میں ''بلقیس مینارِیسی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی کیونکہ سبا کی ملکہ بلقیس، جنہوں نے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شادی کر لی تھی، کا شاید ہی کبھی انقرہ سے گزر رہا ہو گا۔

مینار دیکھنے کے بعد ہم شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم انقرہ کے رنگ روڈ پر پہنچ گئے۔ اب ہماری منزل ''بُرسا'' تھی جس کے لئے ہمیں استنبول کی جانب سفر کرنا تھا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک بڑے سے بورڈ پر ''قونیہ'' لکھا نظر آیا۔ ہمارے سفر کے ابتدائی پلان میں قونیہ شامل تھا مگر اردن کا ویزا نہ ملنے کے باعث ہمیں جنوبی ترکی کے سفر کا ارادہ

منسوخ کرنا پڑا تھا ورنہ سفر کافی لمبا ہو جاتا۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس شہر کی کچھ تفصیل بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیں کیونکہ مذہبی تاریخ میں قونیہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

قونیہ اور تصوف کی عالمگیر تحریک

قونیہ ایک قدیم شہر ہے۔ سلجوقیوں کے زمانے میں یہ ان کی سلطنت کا دارالحکومت رہا ہے۔ مذہب اور تصوف سے متعلق کسی بھی شخص کے سامنے اگر قونیہ کا نام لیا جائے تو جو اگلا نام اس کے ذہن میں آتا ہے وہ مولانا جلال الدین رومی کا ہے جو کہ مولانا روم کے نام سے مشہور ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی

مولانا کا شمار اہل تصوف کی اعلیٰ ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ 1207ء یا 604ھ میں موجودہ افغانستان کے شہر بلخ میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی۔ جوانی کی عمر میں وہ شام چلے گئے اور حلب اور دمشق کے بڑے مدارس سے انھوں نے اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ آپ فقہ، علم کلام اور تصوف کے بڑے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے قونیہ میں رہائش اختیار کی جو کہ سلجوقی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلیم و تعلم کے مواقع بھی زیادہ ہوں گے۔

یہاں ان کی ملاقات شمس تبریزی نام کے ایک بزرگ سے ہوئی۔ یہاں سے ان کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ شمس تبریزی کی صحبت نے انہیں ایک مکمل صوفی بنا دیا۔ مولانا کو ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اچانک ان کے مرشد شمس تبریزی غائب ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے انہیں قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد مولانا روم بیمار اور بے قرار رہنے لگے۔ اسی کیفیت میں انہوں نے اپنی مشہور زمانہ مثنوی لکھی۔ انہوں نے 1273ء یعنی 672ھ میں وفات پائی۔

مثنوی مولانا روم

مولانا روم کی تصوف کے لئے خدمات بے پناہ ہیں۔ ان کی مثنوی کا شمار اہل تصوف کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے اشعار کی تعداد 2500

سے زائد ہے۔ علامہ اقبال اس مثنوی سے بہت متاثر تھے۔ وہ مولانا روم کو اپنا مرشد کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے لئے ''مرشد رومی'' اور خود کے لئے ''مرید ہندی'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

مولانا روم ایک بہت بڑے صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلی درجے کے شاعر تھے۔ انھوں نے تصوف کی تعلیمات کو اشعار کی زبان میں پیش کیا۔ چونکہ مسلم دنیا میں شعر و شاعری کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ نہ صرف ادب اور تصوف، بلکہ ریاضی، سائنس اور گرامر جیسے خشک مضامین کو بھی اشعار میں بیان کیا جاتا تھا، اس وجہ سے ان کی مثنوی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فارسی ادب میں مثنوی مولانا رومی کو بلا مبالغہ مقبول ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔

میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے شعر و شاعری کو اتنی اہمیت کیوں دی کہ حساب اور گرامر جیسے مضامین بھی اس میں بیان کیے۔ اس سوال کا جواب مجھے البیرونی کی مشہور زمانہ ''کتاب الہند'' سے ملا۔ البیرونی جو کہ ایک بڑے سائنسدان، جغرافیہ دان، مورخ، سیاح اور ادیب ہیں، بیان کرتے ہیں کہ علوم سے ناواقف کاتب حضرات کتاب کو نقل کرتے ہوئے اس میں بہت سی غلطیاں کرتے ہیں اور بات کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس وجہ سے قدیم دور میں یہ رواج رہا ہے کہ بات کو اشعار میں بیان کیا جائے۔ وزن، قافیے اور ردیف کی پابندیوں کے باعث اشعار کی غلطی فوراً پکڑی جاسکتی ہے۔ انہیں آسانی سے یاد کیا جاسکتا ہے اور صحیح طور پر اگلوں کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔

مثنوی ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ ہر شعر کا ایک نیا ہی قافیہ ہوتا ہے۔ اشعار کے ہم وزن ہونے کی شرط کے ساتھ شاعر جتنے چاہے شعر کہتا چلا جائے۔ قافیہ کی پابندی نہ ہونے کے باعث عموماً مثنویاں بہت طویل ہوتی ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی بھی سات جلدوں پر مشتمل ہے۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

وقت کی دُھند میں کھو جاتے ہیں
بچے بوڑھے ہو جاتے ہیں

ان اپنوں سے رسمی ناطہ
بیگانے جو ہو جاتے ہیں

دکھ میں کوئی ساتھ ہو اپنا
غم بھی کچھ کم ہو جاتے ہیں

قدرت کا قانون یہی ہے
نقش بھی مدھم ہو جاتے ہیں

رزق ہے ملتا فجر کی ساعت
اور ہم پاگل سو جاتے ہیں

اچھّے لوگوں کی ہے فطرت
پھل نیکی کا بو جاتے ہیں

حرفِ ندامت آنسو بن کر
داغ گناہ کے دھو جاتے ہیں

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

SEP 2018
Vol. 06, No. 09
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi

ابو یحییٰ کی دیگر کتابیں

”ملاقات“

اہم علمی، اصلاحی اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب
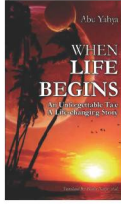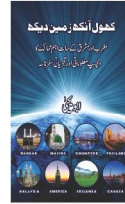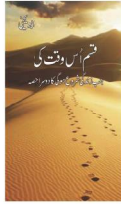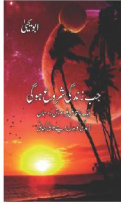
”کھول آنکھ زمیں دیکھ“

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

”جب زندگی شروع ہوگی“

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

”بس یہی دل“

دل کو چھو لینے والے مضامین ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

”قسم اُس وقت کی“

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ”جب زندگی شروع ہوگی“ کا دوسرا حصہ

”تیسری روشنی“

نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

“When Life Begins”

English Translation of Abu Yahya Famous book

Jab ZindagiShuruHo Gee

”حدیثِ دل“

موثر انداز میں لکھے گئے علمی، فکری اور تذکیری مضامین کا مجموعہ

”قرآن کا مطلوب انسان“

قرآن کے الفاظ اور احادیث کی روشنی میں جانیے اللہ ہم سے کیا چاہتے ہیں